

سانحہ راولپنڈی — کڑے احتساب کے ساتھ

ملی یک جہتی اور رواداری کی ضرورت

پروفیسر خورشید احمد

۱۰ محرم الحرام کو راولپنڈی میں جوالم ناک اور خون آشام واقعہ رونما ہوا ہے، اس پر ہر آنکھ اشک بار اور ہرزبان مصروفِ مذمت ہے۔ مسجد، مدرسہ، امام بارگاہ، سب کا تقدس بے دردی اور بے شرمی سے پامال کیا گیا۔ کم از کم ۱۱ افراد شہید ہوئے اور ۱۰۰ کے قریب زخمی، جب کہ ۲۰۰ دکانیں نذر آتش کی گئیں۔ قیمتی جانی اور مالی نقصان کا ابھی پورا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ توقع ہے کہ جو تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا ہے وہ پورے حالات کا بے لاگ جائزہ لے کر تمام صورت حال قوم کے سامنے لائے گا۔ تاہم، یہ ایک حقیقت ہے کہ اس واقعے نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ پوری قوم مغموم اور مشتعل ہے۔ بڑے بنیادی سوالات ہیں جو ہر ذہن کو پریشان کر رہے ہیں اور ان کے واضح جواب تلاش کرنا ربابِ حکومت کی ذمہ داری ہے تاکہ قوم کے سامنے تمام حقائق آسکیں اور اس خونیں واقعے کے تمام ذمہ داران کو قراوقعی اور عبرت ناک سزا مل سکے۔

بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ واقعہ محض اتفاقی نہیں اور قوم کو فرتہ واریت کی جنگ کی طرف دھکیلنے کے کسی منصوبے کا پیش خیمہ ہے، اور حکومت کی بے تدبیری، نااہلی اور پوری انتظامی مشینری کی غفلت یا کچھ سرکاری عناصر کی معاونت سے اتنا بڑا واقعہ رونما ہوا ہے۔ پانچ گھنٹے تک معصوم انسان مرتے رہے۔ عبادت گاہیں، مدرسے اور دکانیں جلتی رہیں اور پوری سرکاری مشینری غیر حاضر یا غیر موثر تھی اور بالآخر شہر میں کرفیو لگانا پڑا اور فوج کو انتظام سپرد کرنا پڑا۔ جو عناصر اس تباہی کے ذمہ دار ہیں ان کو پوری دیانت اور سرعت سے حقیقی آہنی ہاتھوں سے قانون کے مطابق گرفت میں لانے کی

ضرورت ہے۔ روایتی تحقیقات اور لیپاپوتی نے حالات کو بگاڑ کی اس انتہا پر پہنچا دیا ہے جہاں آج ہم ہیں۔ اس مجرمانہ روش کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

مسئلے کے تین پہلو ہیں جن کی طرف ہم توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں:

اولاً: پورے معاملے کی بے لاگ تحقیق اور پوری شفافیت کے ساتھ اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کم سے کم مدت میں اس تحقیق کی روشنی میں موثر کارروائی۔ شرپسند عناصر اور ان کے پشتی بانوں کو گرفت میں لانا اور موثر اور فی الفور عدالتی کارروائی کے ذریعے انہیں ان کے گھناؤنے جرائم کی پوری پوری سزا۔ اس سلسلے میں شرپسند عناصر کے ساتھ پولیس، انتظامیہ اور خفیہ اداروں کی کارکردگی پر بھی موثر گرفت ہونی چاہیے اور جس کی جتنی ذمہ داری ہے اس کے مطابق اسے سزا ملنی چاہیے تاکہ انصاف ہو اور انصاف ہوتا نظر آئے، اور مجرموں کو کھلے عام سزا ملے تاکہ وہ نشانِ عبرت بنیں اور آئندہ کے لیے ایسے واقعات سے ملک کو محفوظ کیا جاسکے۔

اس کے ساتھ جو افراد متاثر ہوئے ہیں ان کی فوری امداد — شہدا کے خاندانوں اور زخمیوں کی مدد، اور جن کی دکانیں جل گئی ہیں اور عمر بھر کی پونجی سے وہ محروم ہو گئے ہیں ان کی معاشی بحالی کا فوری انتظام، نیز مسجد، مدرسہ اور دکانوں کی فوری تعمیر نو، تاکہ متاثرہ افراد اور اداروں کی تلافی ہو سکے۔ یہ تمام کام پوری مستعدی سے اور کم سے کم وقت میں انجام پانے چاہئیں، اور راولپنڈی کی دینی اور سیاسی قیادت کو اس پورے عمل کی نگرانی کرنی چاہیے۔

دوسرا بنیادی مسئلہ وہ فرقہ وارانہ کشیدگی ہے جو اس واقعے کے نتیجے میں رونا ہوئی ہے۔ اٹکا دگا واقعات پہلے بھی رونا ہوتے رہے ہیں۔ چند گروہ مختلف شکلوں میں اور مختلف مقامات پر یہ کھیل کھیلتے رہے ہیں اور حکومت نے ان عناصر کو قابو کر کے اور قانون کی گرفت میں لانے کے بارے میں مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ الحمد للہ بحیثیت مجموعی پاکستانی معاشرے میں اہل سنت اور اہل تشیع شانہ بشانہ زندگی گزار رہے ہیں اور شرپسند عناصر ان کے درمیان منافرت کے فروغ اور تصادم کے کھیل میں کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن اس واقعے نے نئے خطرات کو جنم دیا ہے اور پورے ملک میں جذبات میں بے حد اضطراب بلکہ اشتعال ہے۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مسئلے کو پوری سنجیدگی سے لیا جائے اور اس چنگاری کو بجھانے کے لیے کوشش کی جائے تاکہ یہ کسی

بڑی آگ کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں بھی ایسے حالات پیدا ہوئے تھے مگر ملک کی تمام ہی دینی جماعتوں نے بڑی حکمت اور بالغ نظری کے ساتھ حالات پر قابو پایا، ملتی یک جہتی کونسل کی شکل میں ایک منظم تحرکی قوت بن کر تمام مکاتب فکر کو ایک دوسرے سے قریب لایا گیا، ایک دوسرے کی بات کو کھلے دل سے سنا گیا اور حقیقی شکایات کا ازالہ کیا گیا، اور ملی یک جہتی، رفاقت باہمی اور رواداری کی راہیں استوار کی گئیں۔ آج اس کی ضرورت ماضی سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ جس طرح اس وقت فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے اور غلط فہمیوں اور دُروہوں کو پیدا کرنے والے عوامل کی نشان دہی کرنے کے ساتھ منفقہ طور پر ایک ضابطہٴ اخلاق طے کیا گیا آج اس کے احیا اور اس پر سختی سے عمل کی ضرورت ہے۔

وقت کی ضرورت ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور ملک کے تمام دینی اور سیاسی عناصر اس سلسلے میں اپنا کردار پوری مستعدی کے ساتھ انجام دیں۔ ملتی یک جہتی کونسل کو بھی اس سلسلے میں از سر نو پہل کرنا چاہیے۔ اسی طرح مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ان اصولوں کی روشنی میں فی الفور ضروری قانون سازی کا اہتمام کرنا چاہیے، نیز مسجد و محراب، اسکول اور مدرسہ، اور میڈیا سے ان اصولوں کی بار بار تلقین کی جائے اور عملان کے احترام کا اہتمام کیا جائے۔

ملی یک جہتی کونسل کا طے کردہ ضابطہٴ اخلاق

۱- اختلافات اور بگاڑ کو دُور کرنے کے لیے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ تمام مکاتب فکر نظم مملکت اور نفاذ شریعت کے لیے ایک بنیاد پر متفق ہوں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ہم ۳۱ سرکردہ علما کے ۲۲ نکات کو بنیاد بنانے پر متفق ہیں۔

۲- ہم ملک میں مذہب کے نام پر دہشت گردی اور قتل و غارت گری کو اسلام کے خلاف سمجھنے، اس کی پُر زور مذمت کرنے اور اس سے اظہارِ براءت کرنے پر متفق ہیں۔

۳- کسی بھی اسلامی فرقے کو کافر اور اس کے افراد کو واجب القتل قرار دینا غیر اسلامی اور قابلِ نفرت فعل ہے۔

۴- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و حرمت ہمارے ایمان کی بنیاد ہے اور آنحضور کی کسی طرح کی توہین کے مرتکب فرد کے شرعاً و قانوناً موت کی سزا کا مستحق ہونے پر ہم متفق ہیں۔

اس لیے توہین رسالت کے ملکی قانون میں ہم اس میں ہر ترمیم کو مسترد کریں گے اور متفق اور متحد ہو کر اس کی مخالفت کریں گے۔ عظمت اہل بیت اطہار و امام مہدی رضی اللہ عنہم، عظمت ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور عظمت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین و خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین ایمان کا جز ہے۔ ان کی تکفیر کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے اور ان کی توہین و تنقیص حرام اور قابل مذمت و تعزیری جرم ہے۔

۵- ایسی ہر تقریر و تحریر سے گریز و اجتناب کیا جائے گا جو کسی بھی مکتبہ فکر کی دل آزاری اور اشتعال کا باعث بن سکتی ہے۔

۶- شرانگیز اور دل آزار کتابوں، پمفلٹوں اور تحریروں کی اشاعت، تقسیم و ترسیل نہیں کی جائے گی۔
۷- اشتعال انگیز اور نفرت انگیز مواد پر مبنی کیسٹوں پر مکمل پابندی ہوگی اور ایسی کمیٹیاں چلانے والا قابل سزا ہوگا۔

۸- دل آزار، نفرت آمیز اور اشتعال انگیز نعروں سے مکمل احتراز کیا جائے گا۔

۹- دیواروں، بسوں اور دیگر مقامات پر دل آزار نعرے اور عبارتیں لکھنے پر مکمل پابندی ہوگی۔

۱۰- تمام مسالک کے اکابرین کا احترام کیا جائے گا۔

۱۱- تمام مکاتب فکر کے مقامات مقدسہ اور عبادت گاہوں کے احترام و تحفظ کو یقینی بنایا جائے گا۔

۱۲- جلسوں، جلوسوں، مساجد اور عبادت گاہوں میں اسلحہ خصوصاً غیر قانونی اسلحے کی نمائش نہیں ہوگی۔

۱۳- عوامی اجتماعات اور جمعہ کے خطبات میں ایسی تقریریں کی جائیں گی جن سے مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں مدد ملے۔

۱۴- عوامی سطح پر ایسے اجتماعات منعقد کیے جائیں جن سے تمام مکاتب فکر کے علماء بیک وقت خطاب کر کے ملٹی یک جہتی کا عملی مظاہرہ کریں۔

۱۵- مختلف مکاتب فکر کے محققات اور مشرک عقائد کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

۱۶- باہمی تنازعات کو افہام و تفہیم اور تحمل و رواداری کی بنیاد پر طے کیا جائے گا۔

۱۷- ضابطہ اخلاق کے عملی نفاذ کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ تشکیل دیا جائے گا جو اس ضابطے کی خلاف ورزی کی شکایات کا جائزہ لے کر اپنا فیصلہ صادر کرے گا، اور خلاف ورزی کے

مرتبک کے خلاف کارروائی کی سفارش کرے گا۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم ایک تیسری بات بھی کہنا چاہتے ہیں اور پوری ذمہ داری اے باکی کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک مدت سے مغربی اقوام اور خصوصیت سے امریکا کے پالیسی ساز اداروں اور خود امریکی حکومت کی یہ پالیسی رہی ہے کہ مسلم دنیا کو تقسیم در تقسیم کا نشانہ بنایا جائے، اور اس میں نسلی اور زبانی عصبتوں کے ساتھ مذہبی، مسلکی اور فرقہ وارانہ عصبتوں کو ابھارا جائے اور ان کی بنیاد پر مسلم ممالک کو تقسیم کیا جائے۔

اس سلسلے کا آغاز مغربی استعمار کے مسلم دنیا پر غلبے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور دولت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ان ہی عصبتوں کو ابھارا گیا تھا۔ پھر ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہنری کسنجر نے عرب دنیا کو امریکا کے قابو میں رکھنے اور اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنے کے مذموم مقاصد کو یقینی بنانے کے لیے جو حکمت عملی تجویز کی تھی، اس میں نسلی اور مذہبی عصبت کی بنیادوں پر عرب ممالک کے سیاسی نقشے کی ازسرنو تشکیل کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ متعدد امریکی تھنک ٹینک انھی خطوط پر پالیسی سازی کے مشورے دیتے رہے ہیں اور نئے سیاسی نقشے بنانے میں مصروف ہیں۔

رابن رائٹ نے نیویارک ٹائمز میں ۲۸ ستمبر ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں مشرق وسطیٰ کا ایک نیا نقشہ تجویز کیا ہے جو نئی سنی اور شیعہ ریاستوں سے عبارت ہوگا اور آج کے پانچ ممالک ۱۲ ملک بن جائیں گے۔ عراق اس کی پہلی بڑی تجربہ گاہ بنائی گئی تھی اور شام، بحرین اور افغانستان کو اس آگ میں دھکیلنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور پاکستان بھی اس مذموم ایجنڈے کا حصہ ہے۔ مقصد یہ کہ جہاں بھی کسی ملک کو فوری طور پر تقسیم کیا جاسکتا ہو، وہاں اس کے لیے فضا ساز گاری جائے اور جہاں فرقہ وارانہ اور مسلکی ریاستیں نہ بھی بن سکتی ہوں وہاں بھی فرقہ اور مسلک کی بنیاد پر مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کا کھیل کھیلا جائے، اور اس میں امریکا ہی نہیں چند مسلمان ممالک کے کچھ حکمران بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

عراق میں امریکا نے یہ سارا کھیل کس طرح کھیلا ہے، اس کی پوری تصویر ایک تجزیہ نگار ایشلے اسمتھ (Ashley Smith) نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں پیش کی ہے جو کاؤنٹرپنچ کے ۱۱ نومبر ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس سے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں تاکہ

سامراجی قوتوں کے اصل کھیل کو سمجھا جاسکے اور ان لبرل دانشوروں کا اصل چہرہ بھی دیکھا جاسکے جو اس خطرناک کھیل میں آلہ کار بن رہے ہیں۔

بلاشبہ بیرونی قوتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنا کھیل کھیل رہی ہیں لیکن ان کو اعوان و انصار ہمارے اپنے درمیان سے مل رہے ہیں، اور ہماری فکری اور سیاسی قیادت اپنی لاعلمی یا مفادات کی پرستش میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے مقاصد کے آگے بڑھانے کا ذریعہ بن رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ قوم ان بیرونی سازشوں کو بھی سمجھے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے گھر کی حفاظت اور اپنی صفوں کو ایسے عناصر سے پاک کرنے کی فکر کرے جو اس خطرناک کھیل کا حصہ بن رہے ہیں۔

ایشیے سمجھ صاف لفظوں میں کہتا ہے:

عراق اور خطے میں فرقہ واریت پھیلنے کے پیچھے اصل مجرم امریکا ہے۔

بش انتظامیہ سنیوں اور شیعوں دونوں کی اس مزاحمت کے خلاف جنگ کی مرتکب ہوئی جو وہ بیرونی استعمار کے خلاف کر رہے تھے۔ امریکی افواج نے پہلے سنی مزاحمت کو بہت زیادہ ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا اور گھروں پر حملے، عام آدمیوں کی پکڑ دھکڑ، ابوغریب میں قیدیوں پر نارچر، اور پورے پورے شہروں، جیسے فلوجہ میں تباہی پھیلانے کو ہدف بنایا۔ اس کے ساتھ ہی امریکا نے شیعہ رہنما مقتدا الصدر اور اس کی مہدی فوج کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا۔ ایک مختصر عرصے کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹی پھوٹی سنی اور شیعہ مزاحمت جو متحد ہونے والی ہے، اس کو روکنے کے لیے واشنگٹن نے سامراج کی پٹاری کا پرانا نسخہ: تقسیم کرو اور حکومت کرو کو استعمال کیا۔ اس طرح امریکا نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے فرقہ واریت کو بڑھایا جس کے ذریعے عراق میں جاری تشدد کا بیج ڈالا گیا۔

ایشیے سمجھ نے اپنے مضمون میں صدر بش کے دور میں رو بہ عمل لائی جانے والی حکمت عملی کا قدم بہ قدم ذکر کیا ہے اور پوری تفصیل سے امریکی اقتدار کے چھ سال کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ کس طرح عراق میں شیعہ سنی تصادم کی آگ کو بھڑکایا گیا، اور اب عراق شیعہ، سنی اور کرد تین حصوں میں عملاً بٹ چکا ہے۔

اپنے اس تجربے کی تائید میں ایٹلے اسمتھ نے ایک اور مصنف نیر روزن (Nir Rosen)

کی کتاب *Aftermath: Following the Bloodshed of America's Wars in the Muslim World* کا حوالہ دیا ہے جس کا ایک اقتباس چشم کشا ہے:

گوشیہ اور سنٹیوں کے درمیان کبھی بھی مکمل ہم آہنگی نہیں رہی، لیکن ان کے درمیان عراق پر امریکی حملے کے وقت تک جنگی خانہ جنگی کی تاریخ بھی نہیں تھی۔ آج اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر فروغ دینے والی فرقہ واریت، ذرائع ابلاغ میں مباحث کی بھرمار اور سیاست دانوں اور علما کے جو مباحثے نظر آ رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں تھی، لیکن عراق پر قبضے کے بعد جو علاقے امریکا کے قبضے میں تھے ان میں سنٹیوں اور شیعوں کے درمیان خونیں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں تک کہ شیعہ اور سنی تعلقات اس سطح تک پہنچ گئے کہ اگر آپ کسی اجنبی سے ملیں تو پہلی بات یہ جاننا چاہیں گے کہ وہ شیعہ ہے یا سنی۔

اسی طرح خود ریڈ کارپوریشن جو امریکا کا ایک بہت ہی معروف اور بااثر تحقیقی ادارہ ہے، اس کی ایک اہم رپورٹ *The Muslim World After 9/11* جو صدر جارج بش کے دوسرے دور میں شائع ہوئی تھی اور جو باقاعدہ امریکا کی ایئر فورس کی دعوت پر تیار کی گئی تھی اور اس واضح مقصد کے لیے تیار کی گئی تھی کہ مسلم دنیا میں وہ کون کون سے کمزور پہلو ہیں جن کا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ تحقیق کروانے والوں کے اپنے الفاظ میں:

فرقہ، نسل، علاقہ اور قوم کی بنیاد پر جو تفریق موجود ہے اس کی تشخیص کرنا اور یہ اندازہ کرنا کہ اس تفریق سے امریکا کے لیے کس طرح کے چیلنج اور مواقع پیدا ہو رہے ہیں۔ ریڈ کارپوریشن نے اس تحقیقی رپورٹ میں یہ مشورہ دیا تھا کہ: ”شیعہ سنی اور عرب اور غیر عرب کے اختلاف کو مسلم دنیا میں امریکا کے پالیسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔“

اس رپورٹ میں اس توقع کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ نئے حالات میں خود سعودی عرب کی شیعہ آبادی امریکا کی طرف اپنے جھکاؤ کا مظاہرہ کرے گی:

ان کی اُمید یہ ہے کہ عراق میں جمہوریت کے ذریعے شیعہ اکثریت کو اس ملک میں

دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔

معلوم ہوا کہ اللہ کی رسی، یعنی دین اور شریعت کو مضبوطی سے تھامنا ہی دنیا میں راہِ ثواب کے حصول اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ ہے اور اُمت کی وحدت کتاب و سنت پر قائم رہنے پر منحصر ہے۔ پھر تفرقہ اور آپس میں پھوٹ ڈالنے سے واضح طور پر منع فرمایا ہے کہ یہ اُمت کو پارہ پارہ کرنے کا راستہ ہے۔ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اختلاف سے منع نہیں کیا، تفرقے سے روکا ہے اور دونوں میں جوہری فرق ہی یہ ہے کہ اختلاف، اخلاص اور دیانت سے، دلیل کی بنیاد پر، تلاشِ حق کے جذبے ہی کی خاطر ایک فطری عمل ہے جس کی روایت دور رسالت مآب اور صحابہؓ سے آج تک اُمت کی روشن شاہراہ کا حصہ رہی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: اِخْتِلَافُ اُمَّتِي رَحْمَةٌ ”میری اُمت کے درمیان اختلاف راے ایک رحمت ہے۔“

مفتی محمد رفیع عثمانی ’اختلاف‘ اور ’تفرق‘ کا فرق یوں واضح فرماتے ہیں کہ ”اختلاف کا حاصل اور لب لباب تین چیزیں ہیں: ایک یہ کہ جو اختلاف قرآن و سنت کی بنیاد پر اخلاص و للہیت کے ساتھ ہو، اور اختلاف کرنے والوں میں وہ اہلیت بھی موجود ہو جو اس کے لیے ضروری ہے، تو یہ اختلاف ممنوع نہیں بلکہ اُمت کے لیے رحمت ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ اختلاف ایسے مسائل میں ہو جن میں قرآن و سنت نے کوئی دو ٹوک فیصلہ نہیں کیا، اور ایسے مسائل میں جن میں اجتہاد کی گنجائش ہوتی ہے، یعنی ایک سے زیادہ آرا کا احتمال ہوتا ہے۔ ان میں جو فریق بھی جو راے دلائل کی بنیاد پر قائم کر لے وہ ناجائز اور ناپسندیدہ نہیں ہوتی۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہم جو، مثلاً یہ کہتے ہیں کہ ہم حنفی ہیں اور فلاں شافعی یا مالکی یا حنبلی ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہی یقیناً، یقیناً صحیح ہے، اور امام شافعیؒ کا قول یا کسی اور امام، مثلاً امام احمد بن حنبلؒ یا امام مالکؒ کا قول جو اس کے مقابلے میں ہے، وہ یقیناً غلط ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارا قول مَظْنُونُ الصَّوَابِ اور مُحْتَمَلُ الْخَطَاہِ ہے،

جب کہ دوسروں کا قول مَظْنُونُ الْخَطَاءِ اور مُحْتَمَلُ الصَّوَابِ ہے، یعنی ظن غالب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا قول صحیح ہے، اگرچہ احتمال اس کے غلط ہونے کا بھی ہے۔ دیگر ائمہ کے بارے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ہمارا ظن غالب یہ ہے کہ وہ خطا ہے لیکن احتمال یہ بھی ہے کہ وہ صحیح ہو۔

دوسری چیز ہے 'تفرق'، یعنی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا۔ یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ شریعت نے کسی بھی حالت میں اس کی اجازت نہیں دی۔ خنزیر کا گوشت کھانا جتنا بڑا احرام ہے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اس سے بڑا احرام ہے۔ خالص انگور کی شراب پینا جتنا بڑا گناہ ہے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اس سے بڑا گناہ ہے..... لیکن مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی اجازت کسی حالت میں نہیں دی۔ جتنا ہم نے قرآن و سنت میں غور کیا اور جتنا ہمارے بزرگوں نے ہمیں سکھایا، ہمیں یہی نظر آیا کہ 'تفرق' اور فرقہ بندی کے جواز کی کوئی صورت نہیں۔“

اور پھر رواداری اور رحماء بینہم بننے کا نسخہ بھی یوں بیان کرتے ہیں: ”اس سلسلے میں حکیم الامت حضرت تھانوی کا ملفوظ جو بہت مختصر ہے، یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ ”اپنا مسلک چھوڑو نہیں، دوسروں کا مسلک چھیڑو نہیں۔“ جو جس مسلک کا پیروکار ہے وہ اپنے مسلک پر عمل کرے، لیکن دوسروں کو نہ چھیڑے۔ پس میری گزارشات کا خلاصہ یہ نکلا کہ اختلاف رائے جائز ہے اور اختلاف کرنے والوں کی آرا کا احترام لازم ہے لیکن افتراق کسی حال میں جائز نہیں۔ ہم اسی افتراق کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں۔ آج کفر ہمیں مٹانے پر تلا ہوا ہے، اور ہم آپس میں جھگڑے کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مسلک پر عمل کرے اور بھائیوں کی طرح مل کر رہیں اور مل کر کفر کا مقابلہ کریں۔“

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی حالت اور وقت کی ضرورت دونوں کو کس خوبی سے پیش کیا

ہے:

ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک	منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک	حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں	فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں